راہ معرفت (2)

راہِ معرفت

- دنیا کے بارے دین کا نقطۂ نظر
- ایمان کے فوائد

المہدیؑ ادارۂ تربیت اسلامی
آئی ایس او پاکستان

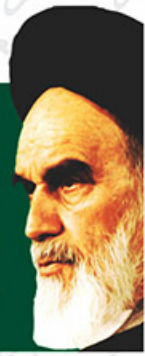

شہید مطہری اپنی پوری عمر اسلامِ عزیز کے مقدس اہداف کے حصول کی جدوجہد میں مصروف رہے، بے راہ رویوں اور انحرافات کے خلاف جانفشانی سے نبرد آزما ہوئے، شہید مطہری دین اسلام اور اس کے مختلف علوم میں تبحر اور قرآن حکیم کے حقائق وغوامض کی بصیرت ومعرفت میں اپنی مثال آپ تھے، شہید مطہری میری عمر کا حاصل تھے۔

امام خمینیؒ

شہید مطہری انقلاب اسلامی کا فکری ستون ہیں اور انقلاب کی کامیابی بلکہ اس کو وجود میں لانے میں شہید مطہری کا بہت بڑا کردار رہا ہے اگر آج بھی آپ اسلام کے ترجمان بننا چاہیں اور دینی معارف کو سمجھنا چاہیں تو لازمی ہے کہ کم از کم ایک بار اُستاد مطہری کے تمام آثار اور کتب کا مطالعہ کریں۔

رہبر معظم سید علی خامنہ ایؒ

المہدیؑ ادارۂ تربیت اسلامی
آئی ایس او پاکستان

راہ معرفت (۲)

۱۔ دنیا کے بارے میں دین کا نقطۂ نظر

اہداف:

۱۔ دنیا کے بارے میں دین کا نقطۂ نظر کیا ہے؟

۲۔ دنیا کے بارے میں قرآن کا نقطۂ نظر کیا ہے؟

۳۔ دنیوی اور اخروی زندگی میں سے کس کو ترجیح دیں؟

۴۔ دنیا کے بارے میں کونسی طرز فکر مذموم ہے؟

ہمارا موضوع سخن دنیا کے بارے میں مذہب کا نقطہ نگاہ ہے لیکن ہم صرف اسلامی نقطۂ نظر سے بحث کریں گے۔ خاص طور پر قرآن نے اس ضمن میں جو تصور پیش کیا ہے۔ اس کی وضاحت بہت ضروری ہے کیونکہ یہ عام دستور ہو گیا ہے کہ مذہب کے نام پر جو وعظ و نصیحت کی جاتی ہے اس میں سارا زور دنیا کی مذمت اور ترک دنیا کی ترغیب پر ہوتا ہے۔ جو شخص واعظ بننا اور وعظ کہنا چاہتا ہے، پہلا خیال اس کے ذہن میں یہی آتا ہے کہ دنیا کی مذمت اور ترک دنیا سے متعلق کچھ اشعار یا نثر کے جملے رٹ لیے جائیں۔ یہی وجہ ہے کہ جتنا یہ مضمون لوگوں کے کانوں میں پڑا ہے، اس قدر کوئی اور مضمون نہیں پڑا۔

چونکہ اس موضوع کا تعلق اخلاق عامہ اور زندگی کے مسائل سے ہے، اس لیے اس کی اہمیت بھی بہت ہے۔ اگر اس معاملے کی مناسب اور معقول توجیہہ کی جائے تو اس کا اخلاق کی درستی، خود اعتمادی، بلند نظری، انفرادی خوشحالی اور اجتماعی تعلقات کی عمدگی پر نہایت خوشگوار اثر مرتب ہوگا لیکن اگر اس کی تشریح نامناسب طریقے سے کی جائے تو اس کے نتیجہ میں اعصاب سن ہو جائیں گے، قوت عمل مفلوج ہو جائے گی اور اسی طرح کی انفرادی اور اجتماعی خرابیاں اور برائیاں پیدا ہو جائیں گی۔

زہد و ترکِ دنیا کی غلط تفسیر:

لیکن بدقسمتی سے آہستہ آہستہ زہد کی منفی تشریح ہی مقبول ہوتی چلی گئی اور اس ضمن میں نظم و نثر میں جو پند و نصائح مرتب ہوئے وہ عموماً اس تشریح پر مبنی رہے ہیں جو اعصاب کو شل اور بے حس کرنے والی ہے۔ اس کے دو اسباب تھے، ایک تو قبل اسلام کے بعض خیالات اور فلسفوں کا اثر جن میں اس دنیا کو برا کہا گیا ہے اور ہر برائی گردش روزگار سے منسوب کی گئی ہے۔ مختلف اقوام کے اسلام قبول کرنے اور ان کے آپس میں اختلاط کے نتیجے میں یہ خیالات مسلمانوں میں بھی پھیل گئے۔ دوسرا سبب بعض ناگوار تاریخی واقعات اور گزشتہ چودہ صدیوں کے مخصوص اجتماعی حالات ہیں جن کی وجہ سے مایوسی اور لاتعلقی کی فضا پیدا ہو گئی اور قنوطیت پر مبنی خیالات کو پھیلنے کا موقع مل گیا۔

آیئے براہ راست یہ دیکھیں کہ خود قرآن کا اس ضمن میں کیا نظریہ ہے؟ کیا بدبینی کا یہ فلسفہ قرآن سے اخذ کیا جا سکتا ہے یا قرآن میں اس طرح کی کوئی بات نہیں پائی جاتی۔

ترک دنیا کے بارے میں قرآن کا نظریہ:

قرآن کہتا ہے کہ یہ دنیاوی زندگی فانی ہے اور اس قابل نہیں کہ انسان اسے اپنا مقصد حیات اور منتہائے آرزو قرار دے۔ **اَلْمَالُ وَالْبَنُوْنَ زِيْنَةُ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَالْبَاقِيٰتُ الصّٰلِحٰتُ خَيْرٌ عِنْدَ رَبِّكَ ثَوَابًا وَّخَيْرٌ اَمَلًا** (سورہ کہف۔آیت 46)

"مال اور اولاد دنیاوی زندگی کی ایک رونق ہیں اور اعمال صالحہ جو باقی رہنے والے ہیں، آپ کے پروردگار کے نزدیک ثواب کے لحاظ سے بھی بہتر ہیں اور اس اعتبار سے بھی کہ وہ اس قابل ہیں کہ ان سے امید وابستہ کی جائے"۔

قرآن مجید دنیا کو اس قابل نہیں سمجھتا کہ ساری امیدیں اسی سے وابستہ کی جائیں لیکن ساتھ ہی وہ یہ بھی نہیں کہتا کہ یہ تمام مخلوقات آسمان و زمین، کوہ و دریا، جنگل و صحرا اور انسان و حیوان یا وہ تمام نظام جو اس دنیا میں جاری اور ساری ہے برا ہے، غلط ہے، باطل ہے بلکہ اس کے برعکس وہ اس نظام کو صحیح اور برحق قرار دیتا ہے۔

وَمَا خَلَقْنَا السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ وَمَا بَيْنَهُمَا لٰعِبِيْنَ (الدخان:38)

ہم نے زمین و آسمان اور جو کچھ ان دونوں کے درمیان ہے کھیل کے طور پر نہیں بنایا"۔ قرآن کریم مخلوقات عالم کی از قبیل جمادات اور نباتات و حیوانات قسم کھاتا ہے۔ **وَالشَّمْسِ وَضُحٰهَا O وَالْقَمَرِ اِذَا تَلٰهَا** (الشّمس ۱، ۲) "قسم ہے سورج کی اور اس کی روشنی کی اور اس کے بعد آنے والے چاند کی۔ **وَالتِّيْنِ وَالزَّيْتُوْنِ O وَطُوْرِ سِيْنِيْنَ O وَهٰذَا الْبَلَدِ الْاَمِيْنِ** (التین ۱۔۲) قسم ہے انجیر کی، زیتون کی، طورِ سینا کی اور اس امن والے شہر (مکہ معظّمہ) کی۔ والعادیات ضبحاً فالموریات قدحاً، قسم ہے ہانپتے ہوئے دوڑنے والے اور پھر پتھر پر ٹاپ مار کر آگ جھاڑنے والے گھوڑوں کی۔ **وَنَفْسٍ وَّمَا سَوّٰهَا O فَاَلْهَمَهَا فُجُوْرَهَا وَتَقْوٰهَا** (الشّمس :۳۔۴) قسم ہے جان کی اور اس ذات کی جس نے اس کو مکمل کیا اور پھر اس کو یہ القاء کیا کہ اس کیلئے کیا صحیح ہے اور کیا غلط۔ قرآن میں ارشاد

ہے: **مَا تَرٰى فِيْ خَلْقِ الرَّحْمٰنِ مِنْ تَفٰوُتٍ فَارْجِعِ الْبَصَرَ هَلْ تَرٰى مِنْ فُطُوْرٍ** (الملک :۳) تم اللہ کی صنعت میں کوئی خلل نہیں پاؤ گے۔ ایک بار پھر نگاہ ڈال کر دیکھ لو کیا تمہیں کوئی خلل نظر آتا ہے؟۔

دنیا اور اس کے تخلیقی نظام کو برا سمجھنا اسلام کے اس مرکزی تصور سے جو اللہ کی وحدانیت پر قائم ہے، قطعاً میل نہیں کھاتا۔ اس طرح نظریے کی بنیاد یا تو مادیت اور صالح حکیم و عادل کے انکار پر ہو سکتی ہے یا ثنویت کے اس تصور پر کہ نیکی اور بھلائی کا سرچشمہ اور ہے اور بدی اور برائی کا سرچشمہ کوئی اور جیسا کہ بعض مذاہب کا خیال ہے۔ لیکن ایک ایسے مذہب میں جس کی بنیاد توحید پر ہے اور جس کا خدائے رحمٰن و رحیم اور علیم و حکیم پر اعتقاد ہے۔ اس طرح کے خیالات کی کوئی گنجائش ہی نہیں ہو سکتی۔

خود قرآن مجید کی متعدد آیات میں اس کی تصریح ہے۔

قرآن میں دنیا کو فانی ضرور کہا گیا ہے اور اس کو ایسی گھاس سے تشبیہہ دی ہے جو بارش کے بعد نکل آتی ہے، کچھ دن بڑھتی رہتی ہے پھر زرد اور خشک ہو کر معدوم ہو جاتی ہے لیکن اس سے مقصود دنیا کی برائی نہیں بلکہ انسان کی وقعت میں اضافہ ہے۔ یہ انسان کی شان کے مناسب نہیں کہ وہ مادی چیزوں کو اپنا منتہائے مقصود بنالے لیکن اس کا اس بات سے کوئی تعلق نہیں کہ ہم خود دنیا ہی کو برا سمجھیں۔

یہی وجہ ہے کہ اسلامی مفکرین میں سے کسی نے بھی اس نوع کی آیات کی یہ تفسیر نہیں کی کہ دنیا بری ہے اور آفات کی جڑ گردشِ روزگار ہے۔

کیا دنیا میں دلچسپی لینا مذموم ہے؟:

کچھ لوگوں نے ان آیات کی ایک تفسیر یہ کی ہے کہ ان آیات کا مقصد خود دنیا کی برائی تو نہیں کیونکہ دنیا سے مراد تو یہی چیزیں ہیں جو زمین و آسمان میں موجود ہیں اور ان میں کوئی بذات خود بری نہیں، یہ تو سب صانع ازلی کی حکمت و قدرت کی نشانیاں ہیں جو بری ہو ہی نہیں سکتیں۔ جو چیز مذموم ہے وہ دنیا اور امور دنیا سے دل لگانا اور ان سے محبت اور علاقہ رکھنا ہے۔ گو خود دنیا مذموم نہیں۔ اسی بنیاد پر جیسا کہ ہم سب جانتے ہیں کہ دنیا سے محبت اور لگاؤ کی مذمت کے بارے میں نظم اور نثر میں اتنا کچھ کہا گیا ہے کہ حد و حساب سے باہر ہے۔

یہ تفسیر اتنی عام ہوگئی ہے کہ اگر کسی سے یہ پوچھا جائے کہ دنیا کی برائی کا کیا مطلب ہے تو وہ عموماً یہی جواب دے گا کہ دنیا کی محبت بری ہے ورنہ دنیا خود بری نہیں۔ اگر دنیا بری ہوتی تو خدا اس کو پیدا ہی نہ کرتا۔

یہ تفسیر اگرچہ بہت مشہور ہے اور اسے مسلم الثبوت سمجھا جاتا ہے لیکن یہ بے غبار نہیں، نہ خود قرآنی مضامین سے مطابقت رکھتی ہے۔

پہلے تو یہ دیکھنا چاہیے کہ آدمی کو جو دنیا سے دلچسپی ہے وہ فطری اور قدرتی ہے یا نہیں یعنی کیا آدمی کی فطرت میں شروع ہی سے یہ بات رکھی گئی ہے کہ وہ دنیا میں دلچسپی لے یا یہ دلچسپی بعد میں دوسرے عوامل مثلاً عادت یا دوسروں کو دیکھ کر پیدا ہوجاتی ہے۔ مثلاً یہ دیکھیے کہ ماں باپ بچوں سے اور بچے ماں باپ سے محبت اور تعلق رکھتے ہیں۔ ہر شخص جنسِ مخالف میں دلچسپی لیتا ہے، ہر شخص مال و دولت کا شیدائی ہے، ہر شخص عزت و مقبولیت کا متمنی ہے اور بہت سی چیزیں ہیں جن سے آدمی کو دلچسپی ہے۔

کیا یہ دلچسپی اور تعلق ہر شخص میں فطری ہے یا محض مصنوعی ہے اور غلط تربیت کے نتیجے میں پیدا ہوجاتا ہے۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ یہ دلچسپی فطری ہے اور اگر فطری ہے تو مذموم کیسے ہوسکتی ہے؟ اور یہ کیسے ممکن ہے کہ انسان کا یہ فرض ہو کہ وہ ان تمام تعلقات سے دستبردار ہوجائے، جس طرح مخلوقات عالم میں کسی چیز کو برا نہیں کہا جاسکتا اور کوئی چیز حکمت سے خالی نہیں، جس طرح خود انسان کا کوئی عضو بیکار نہیں، بدن کی چھوٹی سے چھوٹی رگ حتیٰ کہ ایک بال بھی انسان یا حیوان کے بدن میں ایسا نہیں جو ضرورت سے زائد اور خال از مصلحت ہو، اسی طرح انسا کی فطری خواہشات اور قدرتی رجحانات میں بھی کوچیز ایسی نہیں جو بے مقصد ہو اور جس میں کوئی مصلحت نہ ہو۔ بچوں سے محبت، والدین سے تعلق، میاں بیوی کی باہمی الفت، مال و دولت کی رغبت، ترقی کی خواہش، عزت اور مقبولیت حاصل کرنے کی آرزو۔ ان سب میں بڑی حکمتیں ہیں کیونکہ ان کے بغیر انسانی زندگی کا شیرازہ بکھر کر رہ جائے گا۔

علاوہ ازیں خود قرآن کریم نے ان محبتوں کا تذکرہ پروردگار کی نشانیوں کے طور پر کیا ہے مثلاً سورہ روم میں جہاں انسان کی تخلیق، نیند اور بعض دوسری چیزوں کا تذکرہ حکمت و تدبر کی نشانیوں کے طور پر کیا گیا ہے وہیں یہ بھی ارشاد ہے۔

وَمِنْ آيٰتِهٖٓ أَنْ خَلَقَ لَكُمْ مِنْ أَنفُسِكُمْ۔۔۔ (روم:21)

اور اس کی نشانیوں میں سے ایک یہ ہے کہ اس نے تمہارے واسطے تمہاری جنس کے زن و شوہر پیدا کیے تاکہ تم کو ان کے پاس سکون ملے اور تمہارے درمیان محبت و الفت پیدا کی، اس میں ان لوگوں کیلئے جو ان مسائل میں غور و فکر سے کام لیتے ہیں خدا کی تدبیر، تسخیر اور حکمت کی نشانیاں ہیں۔

اگر میاں بیوی کی محبت کوئی بری چیز ہوتی تو اس آیت میں اسے اللہ کی حکمت و تدبیر کی ایک نشانی کے طور پر ہرگز بیان نہ کیا گیا ہوتا۔

ظاہر ہے کہ یہ تعلق انسان کی فطرت کا ایک حصہ ہے اور یہ بھی واضح ہے کہ یہ تعلق وسیلہ ہے اس کا کہ دنیا کے تمام کام باقاعدگی کے ساتھ چلیں۔ اگر یہ تعلق نہ ہوتا تو نہ نسلِ انسانی چل سکتی، نہ زندگی اور تمدن میں پیشرفت ہوتی اور نہ لوگ روزی کمانے کیلئے دوڑ دھوپ اور محنت و مشقت کرتے بلکہ سچ تو یہ ہے کہ روئے زمین پر انسان کا وجود ہی باقی نہ رہتا۔

اس مشکل کے تین حل:

دنیا کے بارے میں دو نظریے ہیں۔ ایک نظریہ تو ان کا ہے جو کہتے ہیں کہ خود دنیا تو بری نہیں لیکن دنیا سے محبت اور تعلق برا ہے۔

جن لوگوں کی نگاہ میں خود دنیا بری ہے اور جو زندگی کو ہی شر اور تباہی قرار دیتے ہیں ان کے نزدیک و انسان کیلئے اس بدبختی سے نجات کا سوائے خودکشی کے اور کوئی طریقہ ہی نہیں۔ سب سے لغو بات ان ہی لوگوں کی ہے اور یہی دنیا کے سب سے بدقسمت افراد ہیں۔ بقول ولیم جیمز، ان کو تو اس چوہے کی طرح جو چوہے دان میں پڑا چیں چیں کر رہا ہو، ہر وقت روتے دھوتے ہی رہنا چاہیے۔

لیکن جو لوگ کہتے ہیں کہ خود دنیا بری نہیں، اس سے تعلق برا ہے، وہ یہ کہتے ہیں کہ جلنے پٹخنے کی ضرورت نہیں۔ صحیح حل یہ ہے کہ آدمی صلاح و فلاح کے حصول اور بدبختی سے نجات پانے کیلئے دنیا سے دلچسپی لینا چھوڑ دے اور اس سے تعلق منقطع کرلے اس طرح آدمی دنیا کی برائیوں کے چنگل سے رہائی پاکر سعادت ابدی سے ہم کنار ہوجائے گا۔

اس گروہ کے جواب میں یہ کہنا مناسب ہوگا کہ طبعی اور فطری خواہشات اور رجحانات کا اور ان قوتوں کا جو روح میں رچی بسی ہوئی ہیں، ان کا فلسفیانہ نقطۂ نگاہ کے مطابق جس کی تائید حالیہ نفسیاتی تحقیق سے بھی

ہوتی ہے، قلع قمع نہیں کیا جاسکتا اور نہ ان کو جڑ سے اکھاڑا جاسکتا ہے۔ زیادہ سے زیادہ یہ ہوسکتا ہے کہ ریاضت ومجاہدہ کے نتیجہ میں ان کو لاشعور میں دھکیل دیا جائے۔ ایسی صورت میں وہ اکثر کسی دوسرے راستے سے خطرناک صورت میں ابھرتی ہیں اور ذہنی بیماریوں کا سبب بنتی ہیں۔ دنیا سے قطع تعلق آدمی کیلئے سو فیصد مضر اور نقصان دہ ہے۔ یہ ایسا ہی ہے جیسے کسی عضو مثلاً ہاتھ، پاؤں، آنکھ یا ناک کو کاٹ دیا جائے۔

انسان میں ہر فطری قوت کسی خاص کام اور مقصد کیلئے رکھی گئی ہے اور بیکار پیدا نہیں کی گئی اس لیے کوئی وجہ نہیں ہے کہ کسی قوت کے مرکز کو خراب اور تباہ کر دیا جائے۔

قرآن کا طرزِ تفکر:

قرآن مجید سے جو کچھ مستفید ہوتا ہے وہ یہ نہیں ہے کہ بنیادی طور پر دنیا سے تعلق اور محبت بری بات ہے اور نہ کہیں یہ ہدایت کی گئی ہے کہ دنیا سے بالکل منہ موڑ لیا جائے اور دنیا میں دلچسپی کو ختم کر دیا جائے بلکہ بات کچھ اور ہی ہے۔ قرآن میں جس بات کی مذمت کی گئی ہے وہ ہے دنیا کا ہو کر رہ جانا، دنیا پر قناعت کر لینا اور صرف دنیوی اور مادی امور میں دلچسپی لینا۔

قرآن میں ہے:

الْمَالُ وَالْبَنُونَ زِينَةُ الْحَيَاةِ الدُّنْيَا وَالْبَاقِيَاتُ الصَّالِحَاتُ خَيْرٌ عِنْدَ رَبِّكَ ثَوَابًا وَخَيْرٌ أَمَلًا (سورہ کہف۔ آیت ۴۶)

"مال اور اولاد دنیوی زندگی کی رونق ہیں اور جو اعمال صالحہ باقی رہنے والے ہیں وہ آپ کے پروردگار کے نزدیک ثواب کے لحاظ سے بھی بہتر ہیں اور اس لحاظ سے بھی کہ انہی سے امید وابستہ کی جاسکتی ہے"۔

پس بات اُمید وابستہ کرنے، اپنا مقصود قرار دینے اور مطمع نظر سمجھنے کی ہے۔

قرآن مجید میں اہل دنیا کا حال اس طرح بیان کیا گیا ہے۔

الَّذِينَ لَا يَرْجُونَ لِقَاءَنَا۔۔۔ (الفرقان: 21)

"وہ لوگ جن کو ہم سے ملنے کی توقع نہیں، جو دنیوی زندی سے خوش اور اس پر قانع ہیں اور

جو ہماری نشانیوں کو بھولے ہوئے ہیں"۔

اس آیت میں مادی زندگی سے خوش اور اس پر راضی وقانع ہونے کی بات کی گئی ہے۔ اہل دنیا کا یہ ذکر برے معنوں میں کیا گیا ہے۔ ایک اور جگہ ارشاد ہے:

"آپ نظر انداز کر دیجئے ان کو جو قرآن سے روگردانی کرتے ہیں اور فقط دنیوی زندگی کے خواہاں ہیں۔ وہ اتنا ہی جانتے ہیں۔"

(یعنی ان کی ذہنی سطح اتنی ہی ہے۔)

یہاں پھر ان لوگوں کی بات کی گئی ہے جن کا مقصد بجز دنیا اور کچھ نہیں اور جن کی سوچ مادیات کی سطح سے بلند نہیں۔

زُيِّنَ لِلنَّاسِ حُبُّ الشَّهَوَاتِ مِنَ النِّسَاءِ۔۔۔ (سورہ آل عمران: 14)

"اچھی لگتی ہے لوگوں کو محبت مرغوب چیزوں کی جیسے عورتیں، بیٹے، سونے چاندی کے ڈھیر اور نشان زدہ گھوڑے، مویشی اور کھیتی باڑی۔ یہ سب دنیوی زندگی کا سامان ہے، اور عاقبت کی بھلائی اللہ ہی کے پاس ہے"۔

اس آیت میں بھی فطری خواہش اور قدرتی رجحان کی بات نہیں ہے بلکہ بات یہ ہے کہ کچھ لوگوں کی نظر میں وہ چیزیں جو قدرتی طور پر مرغوب ہوتی ہیں۔ اس طرح سما گئی ہیں کہ وہ ان ہی کی محبت میں الجھ کر رہ گئے ہیں۔ ان کی زندگی کی غرض وغایت بس یہی چیزیں بن گئی ہیں۔ ایک اور جگہ فرمایا گیا ہے:

أَرَضِيتُمْ بِالْحَيَاةِ الدُّنْيَا مِنَ۔۔۔ (التوبہ: 38)

"کیا تم آخرت کے بدلے دنیا لے کر خوش ہو گئے ہو؟ دنیوی زندگی کی تو آخرت کے مقابلے میں وقعت بہت کم ہے۔"

ان سب آیات میں دنیوی تعلقات سے محبت اور ان پر قناعت کرنے پر نکتہ چینی کی گئی ہے۔

مال ودولت، زن وفرزند اور دوسرے دنیوی امور میں دلچسپی لینے اور ان ہی کو اپنا مطمع نظر اور زندگی کا ماحصل قرار دے لینے میں فرق ہے۔ اگر مقصد یہ ہو کہ آدمی کی دلچسپی کو مادی امور تک محدود ہونے سے روکا جائے تو اس کا طریقہ یہ نہیں کہ قدرتی تعلق اور فطری دلچسپی کو ختم کر دیا جائے اور اس کا بالکل سر کچل دیا جائے، بلکہ صحیح طریقہ یہ ہے کہ انسان کے بعض دوسرے رجحانات سے کام لیا جائے اور غیر

مادی دلچسپیوں کو تحریک دی جائے اور ان میں جان ڈالی جائے۔

درحقیقت دینی تعلیمات کا مقصد یہی ہے کہ انسان کے ان اعلیٰ جذبات کو تحریک دی جائے جو اس کی فطرت میں موجود ہیں چونکہ ان جذبات کا تعلق روحانیت سے ہے، اس لیے یہ ذرا دیر میں بیدار ہوتے ہیں اور اس کیلئے انسان کے روحانی شعور کو زندہ اور بیدار کرنا ضروری ہوتا ہے۔

آدمی کا ہر فطری رجحان ایک چشمہ ہے جو اس کی روح سے نکلتا ہے۔ دین کا مقصد یہ نہیں کہ مادی دلچسپیوں کے چشموں کو مسدود کر دیا جائے بلکہ مقصد یہ ہے کہ روحانی چشموں کو بھی جاری کیا جائے بالفاظ دیگر یہ مقصد نہیں کہ ان قوتوں کو کم کیا جائے یا ان پر روک لگائی جائے جو اللہ نے اپنی حکمت کاملہ سے کام لے کر انسان میں پیدائشی طور پر ودیعت کی ہیں بلکہ مقصد یہ ہے کہ روحانی قوتوں کو بھی بروئے کار لایا جائے۔

اس مطلب کی وضاحت ہم ایک سادہ مثال سے کرتے ہیں:

فرض کیجئے کہ کسی کا کوئی بچہ ہے جسے وہ اسکول میں داخل کرا دیتا ہے۔ اگر وہ یہ دیکھتا ہے کہ بچے کو محض کھانے اور کھیلنے ہی سے دلچسپی ہے تو اسے گھبراہٹ پیدا ہوتی ہے۔ وہ بچے پر ناراض ہوتا ہے، اسے کھلنڈرا اور پٹو کہتا ہے۔ اس کو ڈانٹتا ہے۔ وہ یہ چاہتا ہے کہ بچہ اپنے سبق اور لکھنے پڑھنے میں بھی دلچسپی لے۔ یہ قدرتی بات ہے کہ لکھنے پڑھنے میں دلچسپی، کھیل کود اور کھانے پینے میں دلچسپی کی نسبت دیر میں پیدا ہوتی ہے اور اس کیلئے بچے کو شوق دلانے اور آمادہ کرنے کی ضرورت ہوتی ہے۔ انسانی فطرت میں حصول علم کا جذبہ موجود ہے لیکن اس کا ابھارنا ضروری ہے۔

لیکن اس کا یہ مطلب قطعی نہیں کہ باپ نہ چاہتا ہے کہ بچے کو کھیل کود، کھانے اور آرام کرنے سے نفرت ہو جائے اور وہ ان کاموں میں دلچسپی لینا چھوڑ دے۔ اگر کسی وقت باپ کو یہ محسوس ہو کہ بچہ کھیلنے یا کھانے میں بالکل دلچسپی نہیں لے رہا تو اس کو سخت پریشانی ہوگی اور وہ اس کو بیماری سمجھ کر کسی ڈاکٹر سے رجوع کرے گا کیونکہ وہ جانتا ہے کہ جہاں ایک تندرست بچے کو اسکول اور کتاب سے دلچسپی ہونی چاہیے وہاں یہ بھی ضروری ہے کہ بچہ چست اور مستعد ہو۔ کھیل کے وقت کھیلے اور کھانے کے وقت کھائے۔ جب وہ بچے کو کھلنڈرا اور پٹو کہہ کر ڈانٹتا ہے تو وہ درحقیقت اس بات پر خفا ہوتا ہے کہ بچہ صرف کھیلنے یا کھانے میں دلچسپی لیتا ہے۔

اس طرزِ تفکر کی جڑ تصورِ کائنات میں ہے:

قرآن کریم کا دنیا کے بارے میں جو طرزِ فکر ہے اور اس نے جو صرف دنیا اور مادی امور میں دلچسپی کی ممانعت کی ہے، اس کی وجہ کائنات اور انسان کے بارے میں قرآن کا خاص زاویہ نگاہ ہے۔ قرآن کریم کی نظر میں وجود اسی مادی دنیا میں منحصر نہیں ہے۔ یہ دنیا جس درجہ وسیع و عظیم ہے، قرآن اس کا اعتراف کرتا ہے لیکن وہ ایک اور عالم کا بھی قائل ہے جو اس سے بھی زیادہ وسیع ہے۔ دنیا اس کے مقابلے میں کچھ بھی نہیں۔ انسان کے متعلق اس کا نظریہ یہ ہے کہ زندگی اسی دنیا تک محدود نہیں ہے۔ آخرت کی زندگی میں بھی ایک زندگی ہے۔ اگرچہ قرآن کی نظر میں انسان اسی دنیا کے درخت کا ایک پھل ہے لیکن اس کے وجود اور اس کی اس کی زندگی کا دامن اس دنیا سے آگے تک پھیلا ہوا ہے اس لیے یہ ضروری ہوا کہ انسان صرف اسی دنیا اور اس کے ساز و سامان کو منتہائے مقصد یہ سمجھ لے۔ انسان کی اہمیت اس سے کہیں زیادہ ہے کہ وہ اس دنیا پر قناعت کرے۔ امیر المومنین امام علیؑ فرماتے ہیں:

و لبئس المتّجر ان تری الدّنیا لنفسک ثمناً

"یہ بہت ہی گھاٹے کا سودا ہے کہ تم دنیا کو اپنی قسمت سمجھ لو۔"

پس جس طرح قرآنی فلسفہ اور قرآن جہاں بینی کا ایک باب یعنی باب توحید ہمیں، جیسا کہ میں نے گفتگو کے آغاز میں عرض کیا تھا، اس کی اجازت نہیں دیتا کہ ہم اس محسوس دنیا کو بری نگاہ سے دیکھیں، اسی طرح قرآنی فلسفہ اور جہاں بینی کے ایک دوسرے باب کا اقتضاء یہ ہے کہ انسان کا مقصد اعلیٰ اور مطمع نظر اس دنیا اور مادی چیزوں سے بلند تر ہو۔ اس دوسرے باب کا تعلق انسان اور آخرت سے ہے۔

اخلاق اور دنیا پرستی:

ان کے علاوہ اسلام میں ایک اور باب بھی ہے جس کا اقتضاء یہ ہے کہ مادی چیزوں کو زیادہ اہمیت نہ دی جائے۔ یہ باب اخلاقی تربیت کا ہے۔ اس پر تو سب ہی مکاتب فکر متفق ہیں کہ انسان کی معاشرتی زندگی کیلئے ضروری ہے کہ آدمی کو اس طرح تربیت دی جائے کہ اس کا نصب العین روحانی ہو اور وہ مادی چیزوں کے لالچ میں نہ پڑے۔ معاشرے میں حرص کی آگ پھیل جانے سے نہ صرف معاشرے کی ترقی اور

خوشحالی کی راہیں مسدود ہو جاتی ہیں بلکہ اس کا نتیجہ معاشرے کی تباہی اور بربادی کی صورت میں نکلتا ہے۔

انفرادی بھلائی کے نقطۂ نظر سے یہ کہا جا سکتا ہے کہ اس قدر مبالغہ تو غلط ہے کہ بعض فلاسفہ کی طرح یہ کہا جائے کہ آدمی کہ صلاح وفلاح اسی میں ہے کہ وہ بالکل ترک دنیا کر دے لیکن اس میں بھی کوئی شک نہیں کہ فلاح کی پہلی شرط یہ ہے کہ آدمی مستغنی الطبع ہو۔

یہاں ایک اور وضاحت بھی ضروری ہے۔ ہم نے جو یہ کہا ہے کہ مقصد صرف یہ ہے کہ آدمی کی دلچسپی مادی امور تک محدود ہو کر نہ رہ جائے۔ اس سے یہ شبہ نہیں ہونا چاہیے کہ مطلب یہ ہے کہ خدا سے بھی محبت کی جائے اور مادی چیزوں کو بھی اپنا نصب العین قرار دیا جائے۔ یہ مطلب نہیں، مطلب یہ ہے کہ آدمی کو قدرتی طور پر دنیا کی چیزوں سے ایک تعلق اور دلچسپی ہے اور اس تعلق کی بنیاد ان مصلحتوں پر ہے جو انسان کی خلقت میں ہیں۔ سب انبیاء اور اولیاء کے بھی یہی جذبات تھے۔ وہ دنیا کی نعمتوں سے فائدہ اُٹھاتے تھے اور اس پر خدا کا شکر ادا کرتے تھے۔ دنیا سے فطری تعلق منقطع نہیں کیا جا سکتا اور بالفرض منقطع کیا بھی جا سکتا ہو تو دنیا سے قطع تعلق کوئی اچھی بات نہیں۔

دنیا کی طرف فطری رجحان اور میلان کے علاوہ انسان میں ایک اور صلاحیت بھی ہے اور وہ ہے کسی چیز کو اپنا نصب العین قرار دے لینے کی۔ دنیا اور دنیا کا ساز وسامان نصب العین نہیں ہونا چاہیے۔ یہ ہے دنیا کی وہ محبت جو مذموم ہے۔ فطری رجحانات تو زندگی کا ہتھیار ہیں لیکن کسی چیز کو اپنا مقصود اور نصب العین بنا لینے کی صلاحیت ایک خاص صلاحیت ہے جس کا سرچشمہ انسانیت کی گہرائیوں میں ہے کیونکہ یہ صلاحیت صرف انسان ہی میں پائی جاتی ہے انبیاء اس لیے نہیں آئے کہ وہ فطری رجحانات اور جذبات کو ختم کر دیں بلکہ اس لیے آئے کہ دنیا اور امور دنیا کی بجائے خدا اور آخرت کو نصب العین کے طور پر پیش کریں۔ درحقیقت انبیاء تو صرف یہ چاہتے ہیں کہ دنیا اور مادی امور کو ان کی قدرتی جگہ پر رہنے دیا جائے۔ یہ وہی جگہ ہے جہاں انسان کو ان چیزوں کی طرف اس لیے کشش ہوتی ہے کہ انسان اور دنیا کی چیزوں کے درمیان ایک طرح کا قدرتی رابطہ موجود ہے لیکن ایسا نہ ہو کہ دنیا اور دنیاوی چیزوں کو اس جگہ سے ہٹا کر دل میں بٹھایا جائے جو انسان کے وجود اور اس کی صلاحیتوں کا مرکزی مقدس مقام اور لاہوت کی طرف کشش کا مرکز ہے۔ ایسا کرنے سے غیر متناہی کمال کی طرف انسان کی پرواز قدرتی طور پر رک جائے گی۔

یہ جو قرآن کریم میں آیا ہے کہ: ما جعل اللہ لرجل من قلبین فی جوفہ، یعنی اللہ نے کسی کے اندر دو دل

نہیں رکھے۔ اس کا یہ مطلب نہیں کہ لوگ یا تو خدا سے تعلق رکھیں یا زن وفرزند اور مال وغیرہ سے، مطلب یہ ہے کہ نصب العین ایک ہی ہونا چاہیے، نصب العین دو نہیں ہو سکتے، نصب العین یا تو رضائے خداوندی کا حصول ہوگا یا دنیا کی نعمتوں اور لذتوں کا، ورنہ کئی چیزوں میں بیک وقت دلچسپی تو ظاہر ہے ہوتی ہی ہے۔

سوالات

سوال: دنیا کی کون سی قسم قرآن کی نظر میں مذموم ہے؟

سوال: ترک دنیا کی غلط تفسیر کیا ہے؟

سوال: ترک دنیا کے بارے میں قرآن کا نظریہ کیا ہے؟

سوال: کیا دنیا میں دلچسپی لینا مذموم ہے؟

سوال: دنیا کے بارے میں دو نظریے کونسے ہیں؟

سوال: قرآنی آیت، اللہ نے کسی کے اندر دو دل نہیں رکھے، کا مطلب کیا ہے؟

۲۔ایمان کے فوائد

اہداف:

۱۔ایمان کے فوائد جاننا

۲۔اخلاق اور ایمان کا باہمی ربط

۳۔ایمان کے اثرات کے بارے میں آگاہی

ایمان کے بارے میں دو باتیں قابل توجہ ہیں۔ایک تو یہ کہ ایمان یا مذہبی عقیدہ پیدا کیسے ہوتا ہے۔ وہ کیا چیز ہے جس کی وجہ سے آدمی دین کی طرف کھنچتا ہے۔پھر وہ چیز آیا داخلی ہے یا خارجی؟یعنی آیا مذہبی عقیدے کا سرچشمہ خود انسانی فطرت ہے یا کچھ خارجی عوامل انسان کو مذہب کی طرف متوجہ کرتے ہیں؟ بالفاظ دیگر انسان میں جو مذہبی احساس پایا جاتا ہے اس کی جڑ اور اس کی بنیاد کیا ہے اور یہ احساس کتنا حقیقی ہے؟ دوسری بات مذہب اور اس پر ایمان کے اثرات اور فوائد کی ہے، یہ دونوں باتیں دلچسپ اور قابل توجہ ہیں۔

سرمایہ یا دردِسر:

ہماری آج کی گفتگو کا مرکزی نکتہ یہ ہے کہ ایمان اور مذہب پر اعتقاد کا نتیجہ کیا ہے، جس طرح یہ ممکن ہے کہ ایک شخص راسخ العقیدہ مومن ہو، ایسے ہی یہ بھی ممکن ہے کہ کوئی شخص مذہب پر قطعاً اعتقاد نہ رکھتا ہو، لامذہب ہو اور پوری زندگی اسی طرح گزار دے۔اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کیا مذہب پر اعتقاد انسان کیلئے کوئی سرمایہ اور دولت ہے کہ اگر یہ دولت ہاتھ سے جاتی رہے تو زندگی میں سخت نقصان اور گھاٹا ہوگا یا یہ محض ایک طرح کی پابندی اور بوجھ ہے جس کے ہاتھ سے جاتے رہنے سے زندگی میں کوئی خلل واقع نہیں ہوگا بلکہ ایک بوجھ ہلکا ہو جائے گا۔

ٹالسٹائی ہمارے دور کا مشہور اور عظیم مصنف ہے۔وہ کہتا ہے ایمان وہ چیز ہے جس سے انسان کی زندگی ہے۔مطلب یہ ہے کہ ایمان زندگی کی بہترین دولت ہے۔جس نے ایمان ضائع کر دیا۔اس نے زندگی کی سب سے بڑی دولت کھودی۔

بہت سی چیزیں ایسی ہیں جن کو زندگی کا سرمایہ سمجھا جاسکتا ہے۔صحت زندگی کا سرمایہ ہے، اسی طرح سلامتی سرمایہ ہے، دولت بھی سرمایہ ہے، علم بھی، سماجی انصاف بھی، نیک بیوی اور بچے بھی، مخلص دوست

بھی، اعلیٰ تعلیم بھی، ذہنی اور دماغی صحت بھی۔ یہ سب زندگی کا سرمایہ ہیں۔ اگر آدمی کے پاس ان میں سے کوئی ایک بھی چیز نہ ہو تو اس کا مطلب یہ ہے کہ اس کے پاس ایک بڑی دولت کی کمی ہے۔ ان میں سے کسی ایک کا بھی نہ ہونا ایک طرح کی بدقسمتی ہے۔

ایمان بھی زندگی کا سرمایہ ہے بلکہ ان سب سے بڑا سرمایہ ہے۔ قرآن کریم میں ارشاد ربانی ہے:

یاایھاالذین امنو اھل ادلکم۔۔۔!

"اے ایمان والو! کیا میں تمہیں ایسا کاروبار بتاؤں جو تم کو دردناک عذاب سے محفوظ رکھے! تم اللہ اور اس کے رسولؐ پر ایمان لے آؤ"۔

قرآن کریم نے جیسا کہ ہم دیکھتے ہیں، اللہ اور اس کے رسولؐ پر ایمان کو تجارت اور کاروبار سے تعبیر کیا ہے۔

پہلے اس کی وضاحت ضروری ہے کہ انسان سب سے پہلے مادی اور محسوس چیزوں کو سمجھتا ہے۔ اس کی وجہ بھی ظاہر ہے۔ مثال کے طور پر دولت کو لیجئے۔ یہ بھی زندگی کا سرمایہ ہے۔ ہر شخص کو بہت جلد اور بآسانی اس کی قدر و قیمت کا احساس ہو جاتا ہے بلکہ بسا اوقات تو کچھ ضرورت سے زیادہ ہی ہو جاتا ہے جس کی وجہ سے لالچ بڑھ جاتا ہے۔ اس کا نتیجہ متعلقہ شخص اور سوسائٹی دونوں کیلئے دردِسر کی شکل میں نکلتا ہے۔

دوسری طرف اچھے اخلاق، صحیح تربیت اور عمدہ عادات بھی زندگی کا سرمایہ ہیں جن سے ترقی ہوتی ہے، مسرت و خوشحالی میسر آتی ہے بلکہ ان کا اثر و دولت سے بدرجہا زیادہ ہے لیکن انسان کو اس کا احساس ذرا دیر میں ہوتا ہے اور ان کی قدر و قیمت دیر سے سمجھ میں آتی ہے، اس لیے ضروری ہے کہ آدمی یا تو فطری طور پر ہوشیار اور نکتہ شناس ہو کہ از خود عمدہ اخلاق اور اعلیٰ تربیت کی اہمیت اور قدر و قیمت کو سمجھ لے یا پھر اس کو ایسی تعلیم ملے کہ وہ استاد یا پیشوایان انسانیت کی زبان سے ان چیزوں کی اہمیت معلوم کر سکے مثلاً امام علیؑ کا قول ہی **حسن الخلق خیر رفیق** اچھا اخلاق بہترین ساتھی ہے، **رب عزیز اذلۃ خلقہ و رب ذلیل اعزہ خلقہ** کتنے معزز لوگ اپنے اخلاق کی بدولت ذلیل ہو گئے اور کتنے ہی وہ جو گھٹیا سمجھے جاتے تھے، اپنے اخلاق کی وجہ سے صاحب عزت بن گئے۔ اخلاق کے برخلاف دولت ایسی چیز ہے کہ آدمی بچپن ہی سے اس کی قدر پہچاننے لگتا ہے۔

ایمان کا بھی یہی حال ہے، کتنے ہی لوگ ہیں جو اس عظیم نعمت سے بہرہ مند ہیں اور اس کے زیر سایہ خوش و خرم زندگی گزار رہے ہیں۔ ان کی صحت و تندرستی اور ان کی طویل العمری کا راز اس ایمان میں

پنہاں ہے جو ان کے دل میں موجزن ہے گو خود انہیں اس کا احساس نہ ہو۔ اس کے برعکس بہت سے لوگ ہیں جن کی عمر رنج، پریشانی اور خوف میں گزرتی ہے مگر وہ خود یہ نہیں سمجھتے کہ اس کی اصل وجہ یہ ہے کہ زندگی کی ایک بڑی دولت انہوں نے ہاتھ سے گنوادی ہے۔ اس مضمون پر ایمان کے اثرات کی روشنی میں غور کرنے کی ضرورت ہے۔

اخلاق کا سہارا:

پہلی بات تو یہ ہے کہ اخلاق کو ایمان ہی سے سہارا ملتا ہے۔ اخلاق خود زندگی کا ایک بڑا سرمایہ ہے لیکن ایمان کے بغیر اس کی بنیاد مضبوط نہیں ہوتی۔ سب اخلاقی اُصولوں بلکہ تمام روحانیت کی بنیاد اور وجہِ جواز خدا پر ایمان ہے۔ فیاضی، شرافت، عفت، دیانتداری، سچائی، راستبازی، ایثار، حسن سلوک، صلح جوئی، امن پسندی، منصف مزاجی، حقوق انسانی کی علمبرداری اور وہ سب باتیں جن کو اعلیٰ درجے کی انسانی خوبیاں کہا جاتا ہے اور جن کو سب پسندیدہ اور محترم سمجھتے ہیں اور اگر ان میں وہ خوبیاں موجود نہیں بھی ہوتیں،، جب بھی ظاہر یہی کرتے ہیں کہ وہ ان میں موجود ہیں۔ ان سب خوبیوں اور اوصاف کی بنیاد ایمان پر ہی ہے کیونکہ ان میں سے ہر خوبی میں کسی نہ کسی ذاتی اور مادی فائدے سے دستبردار ہونا پڑتا ہے اور آدمی مساوی فائدوں سے محرومی جب ہی گوارا کرتا ہے جب وہ اس محرومی کو محرومی نہ سمجھے جس کیلئے ضروری ہے کہ اس کو روحانی اقدار کا احساس ہو اور وہ ان کی لذت سے واقف ہو اور روحانی امور کی تو بنیاد ہی ایمان پر قائم ہے۔ اللہ پر ایمان اور اس کے عادل اور دانا ہونے پر یقین کا کم از کم یہ نتیجہ تو ہوتا ہی ہے کہ ایک مومن کو بھی یہ اطمینان رہتا ہے کہ کوئی خوبی اور کوئی نیک کام اللہ کے یہاں ضائع نہیں ہو جاتا۔ **ان اللہ لا یضیع اجرا المحسنین** اللہ نیکی کرنے والوں کا صلہ رائیگاں نہیں جانے دیتا۔ اس طرح اس نوعیت کی ہر محرومی کی تلافی ہو جاتی ہے۔

آدمی کے سامنے فقط دو راستے ہیں یا تو وہ محض خود غرض ہو، صرف اپنے فائدے کو دیکھے اور کسی محرومی کو برداشت کرنے کیلئے تیار نہ ہو یا پھر خدا پرست ہو، ایسی محرومی کو محرومی نہ سمجھے جو حسن اخلاق کا مظہر ہو یا کم از کم یہ خیال کرے کہ محرومی کی تلافی ہو گئی۔ ایثار اور احسان کی بنیاد اگر تقویٰ اور رضائے الٰہی کی طلب نہ ہو تو ایسی بنیاد خطرناک ہے۔

أَفَمَنْ أَسَّسَ بُنْيَانَهُ عَلَى تَقْوَى مِنَ اللهِ وَرِضْوَانٍ خَيْرٌ أَمْ مَنْ أَسَّسَ بُنْيَانَهُ عَلَى شَفَا جُرُفٍ هَارٍ۔۔۔ (سورہ توبہ۔۱۰۹)

" آیا ایسا شخص بہتر ہے جس نے اپنی عمارت کی بنیاد خدا کے تقویٰ اور اس کی خوشنودی پر رکھی یا وہ شخص جس نے اپنی بنیاد ایسی گھاٹی کے کنارے پر رکھی جو گرنے ہی والا ہو"۔

جس کے اخلاق اور جس کی شخصیت کی بنیاد غیر اللہ پر ہے، اس کی مثال ایسی ہے جیسے کوئی ایسے کنارے پر کھڑا ہو جہاں سے ہر لحہ کے گر جانے کا اندیشہ ہے۔

مَثَلُ الَّذِينَ اتَّخَذُوا مِنْ دُونِ اللهِ أَوْلِيَاءَ كَمَثَلِ الْعَنكَبُوتِ اتَّخَذَتْ بَيْتًا وَإِنَّ أَوْهَنَ الْبُيُوتِ لَبَيْتُ الْعَنكَبُوتِ۔۔۔ (سورہ عنکبوت۔۴۱)

" جن لوگوں نے خدا کے سوا اپنے اور دوست اور سرپرست تجویز کر رکھے ہیں ان کی مثال مکڑی کی سی ہے جس نے ایک گھر بنایا۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ سب سے بودا گھر مکڑی کا ہی ہوتا ہے"۔

اس آیت میں اس طرف اشارہ ہے کہ اپنے کاموں میں خدا کے سوا کسی پر بھروسہ نہیں کرنا چاہیے کیونکہ اللہ کے سوا ہر سہارا کمزور اور ناقابل اعتبار ہے۔ محض تقلید یا ترغیب کی بنا پر یا عادت ڈال کر لوگوں کو ایثار و قربانی کی عارضی طور پر جبریہ تربیت تو دی جا سکتی ہے لیکن یہ صورت ایک طرح سے بیوقوف بنانے اور مجبور کرنے کی کوشش ہوگی۔ غلط طریقے استعمال کر کے ہمیشہ اور سب لوگوں کو ایثار و قربانی پر آمادہ نہیں کیا جا سکتا۔ حکماء کہتے ہیں **القسر لا یدوم** یعنی غیر فطری حرکت کو دوام نہیں ہوتا۔ جس طرح اللہ کائنات کا سرچشمہ ہے اور تمام موجودات اسی کی ذات کے سہارے سے قائم اور موجود ہیں۔ اسی طرح تمام روحانی اور اخلاقی فضائل کا سرچشمہ بھی ایمان باللہ ہے۔ خدا کے بغیر روحانیت کی مثال ایسے کرنسی نوٹوں کی سی ہوگی جن کی پشت پر کوئی سرمایہ نہ ہو۔ ایسے نوٹوں کی وقعت کاغذ کے پرزوں سے زیادہ نہیں ہو سکتی۔

قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔

وَمَثَلُ كَلِمَةٍ خَبِيثَةٍ كَشَجَرَةٍ خَبِيثَةٍ اجْتُثَّتْ مِنْ فَوْقِ الْأَرْضِ مَا لَهَا مِنْ قَرَارٍ (سورہ ابراہیم۔۲۶)

" کیا آپ نے نہیں دیکھا کہ اللہ تعالیٰ نے کلمہ طیبہ کی کیسی عمدہ مثال دی ہے کہ وہ مشابہ

ہے ایک پاکیزہ درخت کے جس کی جڑیں خوب مضبوط ہوں اور اس کی شاخیں آسمان تک جا رہی ہوں۔ وہ اپنے پروردگار کے حکم سے ہمیشہ پھل دیتا ہو، اللہ ایسی مثالیں لوگوں کیلئے بیان کرتا ہے تاکہ وہ خوب سمجھ لیں۔"

اس مثال کا مقصد یہ ہے کہ اگر یہ منظور ہے کہ انسانیت کا درخت پھلے پھولے تو ضروری ہے کہ اس کی جڑ توحید و ایمان کے اُصولوں پر قائم ہو۔ اس کے بعد ایک اور مثال دی گئی ہے۔ ارشاد ہے:

يُثَبِّتُ اللهُ الَّذِينَ آمَنُوا بِالْقَوْلِ الثَّابِتِ فِي الْحَيَاةِ الدُّنْيَا وَفِي الْآخِرَةِ وَيُضِلُّ اللهُ الظَّالِمِينَ وَيَفْعَلُ اللهُ مَا يَشَاءُ (سورہ ابراہیم۔۲۷)

" گندی بات (باطل اور بے بنیاد عقیدہ) کی مثال ایسی ہے جیسے ایک خراب درخت جس کی جڑیں زمین میں پیوست نہ ہوں اور جو اپنی جگہ قائم نہ رہ سکے"۔

اس کے بعد اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

يُثَبِّتُ اللهُ الَّذِينَ آمَنُوا بِالْقَوْلِ الثَّابِتِ۔۔۔ (ابراهيم:27)

"اللہ تعالیٰ ایمان والوں کو حق و صداقت پر دنیا و آخرت میں ثابت قدم رکھتا ہے"۔

ایمان کے بارے میں ارشاد خداوندی ہے:

أَرَأَيْتَ الَّذِي يُكَذِّبُ بِالدِّينِ O فَذَلِكَ الَّذِي يَدُعُّ الْيَتِيمَ (الماعون :۲،۱)

" کیا آپ نے اس شخص کو نہیں دیکھا جو روزِ جزاء کو جھٹلاتا ہے، یہی وہ ہے جو یتیم کو دھکے دیتا ہے اور محتاج کو کھانا کھلانے کی دوسروں کو بھی ترغیب نہیں دیتا"۔

مطلب یہ ہے کہ جو دین سے روگردانی کرتا ہے وہ تمام خوبیوں اور نیکیوں سے روگردانی کرتا ہے کیونکہ دینی جذبہ ہی انسانیت کی بنیاد اور اس کا سہارا ہے۔ جب دین ہاتھ سے گیا تو سمجھو انسانیت اور انسانی جذبات بھی ہاتھ سے گئے۔

مجموعی طور پر روحانیت کیلئے ایک طرح کی مادی محرومی ضروری ہے اور جب تک بنیاد درست نہ ہو انسان بلا وجہ محرومی برداشت نہیں کرتا۔ اگر خیالات مادہ پرستانہ ہیں تو اخلاق بھی مادہ پرستانہ ہونگے یعنی ان کی بنیاد خود غرضی اور ذاتی فائدے پر ہوگی۔ حکم الٰہی ہے کہ:

يَاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا كُوْنُوْا قَوّٰمِيْنَ بِالْقِسْطِ شُهَدَآءَ لِلّٰهِ وَلَوْ عَلٰٓى اَنْفُسِكُمْ اَوِ الْوَالِدَيْنِ وَالْاَقْرَبِيْنَ (سورہ نساء، آیت۔ ۱۳۵)

"اے ایمان والو! انصاف پر قائم رہو اور اللہ کیلئے گواہی دو، چاہے یہ گواہی خود تمہارے والدین اور رشتہ داروں کے خلاف ہو"۔

یا یہ کہ:

كُوْنُوْا قَوّٰمِيْنَ لِلّٰهِ شُهَدَآءَ بِالْقِسْطِ۔۔۔ (سورہ مائدہ۔ آیت ۸)

"اللہ کیلئے قیام کرو اور انصاف سے گواہی دو، کہیں ایسا نہ ہو کہ کسی قوم کی دشمنی (چاہے دینی ہی ہو) تمہیں حق وعدالت کے راستے ہٹا دے، عدل کرو کہ یہ تقویٰ سے قریب تر ہے۔"

لہٰذا معلوم ہوا کہ اخلاق، سماجی انصاف، انسانیت، سماجی سلامتی سب سرمایہ ہیں جن کے حصول اور حفاظت کیلئے ایک اور سرمایہ کی ضرورت ہے جس کا نام ایمان ہے۔

امیر المومنین حضرت علی علیہ السلام فرماتے ہیں:

"اگر کسی میں ایک بھی اچھی خصلت ہو تو میں اس کی دوسری کمزوریوں کو نظر انداز اور معاف کرسکتا ہوں لیکن دو باتیں ناقابل برداشت ہیں، ایک بے عقلی دوسری بے دینی، اس لیے کہ جس شخص کا دین نہیں اس پر اعتماد نہیں کیا جاسکتا اور بغیر اطمینان اور اعتماد کے زندگی خوشگوار نہیں ہوسکتی اور عقل کا فقدان تو زندگی ہی کا نہ ہونا ہے، بے عقل کا شمار مُردوں ہی میں ہوسکتا ہے"۔

بے دین شخص کی طرف سے ہمیشہ دھڑکا لگا رہتا ہے اور آدمی کو ہر وقت چوکنا رہنا پڑتا ہے کہ کسی وقت دھوکا ہی نہ دے جائے اور جہاں عقل نہیں وہاں زندگی بھی نہیں، بے عقل کو مردہ ہی سمجھنا چاہیے۔

جہاں تک اخلاقی صفات کا تعلق ہے اگر ہم یہ چاہتے ہیں کہ مجموعی طور پر تقویٰ، عفت اور دیانت و امانت کے اوصاف اس قدر پختہ ہوں کہ یہ آدمی کی برائیوں سے وہاں بھی حفاظت کرسکیں جہاں کسی عیب کے ظاہر ہوجانے کا قطعی امکان نہ ہو۔ طاقت کے ہوتے ہوئے کمزوروں اور ماتحتوں سے انصاف کیا جائے، زور آوری کے مقابلے میں جرأت دکھائی جائے، مہر ومحبت اور صدق واخلاص کا دور دورہ ہو تو یہ سب کچھ یا تو ایمان کے سائے میں ہوسکتا ہے یا جب کوئی فرد کامل خالص ایمان کے سائے میں پیدا ہوا اور پلا

بڑھا ہو۔

جسم وجان کی سلامتی:

ایمان کا ایک اور اثر جسم وجان کی سلامتی ہے۔ امام علیؑ تقویٰ کے بارے میں فرماتے ہیں:

دوائُ دائِ قلوبکم و شفائُ مرض اجسادکم

"تقویٰ روحانی بیماریوں کی دوا اور جسمانی امراض کی شفا ہے"

یہ تو ظاہر ہے کہ ایمان کوئی سفوف، قرص یا کیپسول نہیں ہے۔ جسمانی اور روحانی صحت پر تقویٰ کا اثر اس وقت سمجھ میں آتا ہے جب یہ ذہن نشین ہوجائے کہ با ایمان آدمی کی روح زیادہ مطمئن، اس کے اعصاب زیادہ پرسکون اور اس کا دل زیادہ صحت مند ہوتا ہے۔ اس کو ہر وقت یہ فکر نہیں رہتی کہ کس چیز پر قبضہ کرلے اور کیا ہڑپ کر جائے۔ اگر وہ دوسروں کو خوشحال دیکھتا ہے تو اس کے دل میں حسد کی آگ نہیں بھڑکتی۔ وہ حرص، بخل اور لالچ کی آگ میں نہیں جلتا۔ اعصابی بے چینی اسے معدے اور آنتوں کے ناسور میں مبتلا نہیں کرتی، شہوت کی زیادتی اس کو کمزور نہیں کرتی، وہ طویل عمر پاتا ہے۔

جسم وروح کی سلامتی کا ایمان سے گہرا تعلق ہے۔ دماغی امراض کے مریضوں کی تعداد میں روز افزوں اضافہ، جن سے ہسپتال بھرے ہوئے ہیں، آج کا ایک اہم سماجی مسئلہ ہے۔ اعداد وشمار بتلاتے ہیں کہ اس طرح کی بیماریاں اس طبقہ میں زیادہ عام ہیں جو خدا پر ایمان سے بے بہرہ ہیں۔ ذہنی بیماریوں کا اصل سبب محرومیوں اور سماجی ناانصافیوں کا احساس ہے۔ ایمان وہ دوا ہے جو ان امراض سے محفوظ رکھتی ہے اور ان سے بچاؤ کی احتیاطی تدبیر کا کام دیتی ہے۔ بہرحال مطلب یہ نہیں ہے کہ ایمان کا تقاضا یہ ہے کہ سب محرومیوں کے سامنے سر تسلیم خم کردیا جائے بلکہ مقصد یہ ہے کہ ایمان کی موجودگی میں محرومیاں آدمی کو متزلزل نہیں کرتیں اور اس کا توازن برقرار رہتا ہے۔

ماحول سے مطابقت:

ایمان کا ایک اور اثر فرد اور معاشرے میں توازن اور ہم آہنگی پیدا کرنا ہے۔ حیاتیات کا ایک اُصول یہ ہے کہ کسی موجود کی زندگی کی بقاء کیلئے یہ ضروری ہے کہ ماحول اس کی زندگی کیلئے سازگار ہو۔ اگر ماحول

مناسب نہیں تو وہ زندہ موجود اپنے اندر آہستہ آہستہ تبدیلیاں پیدا کرسکتا ہے جن سے ماحول کے ساتھ مطابقت پیدا کر سکے۔ جب تو وہ زندہ رہ سکتا ہے لیکن اگر ایسی مناسب تبدیلیاں پیدا نہ کر سکے تو وہ لازماً فنا ہوجائے گا کیونکہ وہ ماحول کے حالات کا جزو اور ان کے تابع ہے۔

قدرتی ماحول کے لحاظ سے انسان کی بھی یہی صورت ہے۔ اگر انسان کو نامناسب ماحول میں رہنا پڑے تو اس کے بدن کا اندرونی نظام خود بخود ایسی کارروائی شروع کر دیتا ہے جس سے اس میں ماحول سے مطابقت پیدا ہوجائے۔ دوسری طرف انسان خود بھی کوشش کرتا ہے کہ اپنی قوت اختراع سے کام لے کر ماحول اور قدرتی عوامل کا مقابلہ کرے اور ان کو اپنے لیے سازگار بنالے۔

قدرتی ماحول کے علاوہ انسان کا سماجی ماحول بھی ہوتا ہے اس کے ساتھ بھی اس کی مطابقت ضروری ہے۔ کسی معاشرے میں جو افراد رہتے ہیں ان کی عادات و خصائل اور اس معاشرے میں رائج قائدے، قانون اور رسم و رواج سب مل کر سماجی ماحول تشکیل دیتے ہیں۔ انسان کو اپنی خواہشات، رجحانات اور شخصی ضروریات کو اس ماحول کے مطابق بنان پڑتا ہے۔ ان دونوں میں مطابقت ضروری ہے۔ اس کیلئے معاشرے اور فرد دونوں میں لچک کی ضرورت ہے۔ معاشرے میں لچک کا مطلب یہ ہے کہ معاشرہ منصفانہ ہو اور سب افراد کے مفاد کا خیال رکھے۔ فرد میں لچک کا مطلب یہ ہے کہ فرد معاشرے کے مجموعی مفاد کو برضا و رغبت قبول کرے اور بوقت ضرورت اپنی ذاتی خواہشات کو معاشرے کے مجموعی مفادات پر قربان کردے۔ شروع میں قدرتی طور پر فرد اور معاشرے میں مطابقت نہیں ہوتی کیونکہ معاشرے میں طرح طرح کے لوگ ہوتے ہیں۔ ہر ایک کی اپنی رائے، اپنا عقیدہ اور اپنے رجحانات ہوتے ہیں جو دوسروں کے خیالات اور خواہشات سے مختلف اور متضاد ہوتے ہیں۔ اس لیے دونوں طرف سے لچک ضروری ہے تاکہ باہمی مطابقت پیدا ہوجائے۔ لچک کی صورت یہی ہے کہ معاشرہ مجموعی مفاد کا لحاظ رکھے اور فرد اپنے رجحانات اور خواہشات کو معاشرے کی خواہشات اور اس کے مقاصد کے مطابق ڈھال لے۔ بنیادی طور پر یہ مطابقت مذہب کے ذریعے پیدا ہوتی ہے کیونکہ مذہب ہی معاشرے کو انصاف مہیا کرتا ہے اور فرد کو تسلیم و رضا کا سبق سکھاتا ہے۔

تسلیم و رضا کا مفہوم:

چونکہ یہاں تسلیم و رضا کا نام لیا گیا ہے اس لیے ممکن ہے بعض لوگوں کے ذہن میں فوراً یہ خیال آئے کہ معاشرہ فرد کے ساتھ جو بھی سلوک کرے اس پر راضی اور قانع رہنا تو کوئی اچھی بات نہیں۔ یہ سستی اور بے عملی ہے۔ اس کے برعکس بے اطمینانی کا نتیجہ حرکت اور کوشش ہوتا ہے۔

میں عرض کرتا ہوں کہ مطمئن اور قانع ہونے کی بھی دو قسمیں ہیں۔ ان میں سے ایک قسم اچھی اور ضروری ہے اور وہ یہ ہے کہ ہر شخص اپنے حصے پر قانع اور مطمئن رہے۔ آخر ہر شخص کا کچھ حق اور حصہ مقرر ہے۔ اس لیے کسی کو اس فکر میں نہیں رہنا چاہیے کہ سب کچھ خود ہی ہتھیالے۔ آدمی کو چاہیے کہ اپنے حق پر قانع رہے۔

و اجعلنی بقسمک راضیاً قانعاً

"اے اللہ میرے مقسوم میں جو کچھ ہو میں اس پر خوش اور مطمئن رہوں"

تسلیم و رضا کی دوسری قسم ظلم و زیاتی کے سامنے سرِ تسلیم خم کرنا ہے لیکن یہاں مخالفت اور بے اطمینانی کا اظہار نہایت اچھی بات ہے اور صورت حال کو جوں کا توں بخوشی قبول کرلینا نہ صرف ناپسندیدہ بلکہ گناہ ہے۔

نفس پر قابو:

ایمان کی ایک اور خاصیت یہ ہے کہ اس کی بدولت نفس پر قابو حاصل ہوجاتا ہے۔ یہ نہیں سمجھنا چاہیے کہ نفس پر قابو کا مسئلہ ایک مذہبی بات ہے اور اس کی بنیاد عقیدے پر ہے۔ اگر مذہب نہ ہوتا تو نفس پر قابو بھی ضروری نہ ہوتا۔ نفس پر قابو ایسے ہی ایک اخلاقی خوبی ہے جیسے منصف مزاجی یا ثابت قدمی اور وضع داری۔ اگر کوئی مذہب کو نہ بھی مانتا ہو جب بھی ان اوصاف کا انکار نہیں کرسکتا۔ نہ یہ اوصاف مذہب سے نکلے ہیں نہ مذہب کی وجہ سے وجود میں آئے ہیں البتہ یہ ہے کہ مذہب نے ان پر عمل کا بہتر طور پر انتظام کردیا ہے۔

انسان کا اپنا وجود خود ایک ایسا میدان ہے جس پر زندگی کی کشمکش میں تسلط حاصل کرنا ضروری ہے۔ موجود دور کا ایک مشہور مفکر کہتا ہے:

انسان کے تین دشمن ہیں اور اس کو تین محاذوں پر ان کا مقابلہ کرنا ہے۔

ایک محاذ ہے قدرتی عوامل کا، دوسرا محاذ دوسرے لوگوں کے مقابلے کا اور تیسرا محاذ خود انسان کی اپنی ذات کا جس کو اندرونی محاذ کہنا چاہیے۔ پہلے محاذ پر تو انسان نے ایک حد تک کامیابی حاصل کر لی ہے۔ سردی، گرمی، بیماری اور دوسری آفات پر انسان نے بڑی حد تک قابو پالیا ہے۔ اگرچہ اب بھی بعض آفات

جیسے زلزلہ یا کچھ بیماریاں جیسے سرطان ایسی ہیں جن پر ابھی تک انسان قابو نہیں پا سکا۔ غیروں سے مقابلہ تو جاری ہے۔ سب سے بڑھ کر خود اپنے نفس سے جنگ ہے کہ ہر شخص خود اپنے اندر ایک کشمکش میں مبتلا ہے۔

یہ جو ایک مشہور حدیث میں ہے کہ رسول اکرمؐ نے فرمایا:

مرحباً بقومٍ قضوا الجهاد الاصغر

ان لوگوں کی آمد مبارک جو جہاد اصغر کا فریضہ انجام دے کر آئے ہیں (اور جہاد اکبر یعنی نفس کے خلاف جہاد کا فریضہ ابھی ان کے ذمہ باقی ہے)

اس کا مفہوم بھی یہی ہے۔ دین و ایمان ہی ایک ایسی طاقت ہے جس کی مدد سے انسان اپنی طبعی خواہشات پر غلبہ حاصل کر سکتا ہے۔ اسی حدیث کی تشریح کرتے ہوئے مولانا رومی نے کہا ہے:

کشتن ایں ،کارِ عقل و هوش نیست

شیرِ باطن سخرۂ خرگوش نیست

شیخ سعدی کہتے ہیں کہ میں نے ایک بزرگ سے پوچھا کہ اس حدیث کا کیا مطلب ہے کہ

اعدیٰ عدوک نفسک التی بین جنبیک

تمہارا سب سے بڑا دشمن تمہارا اپنا نفس ہے جو تمہارے ہی پہلو میں ہے۔

ان بزرگ نے جواب دیا کہ اور جس کسی پر تم احسان کرو گے وہ تمہارا دوست بن جائے گا مگر تم اپنے نفس کی جتنی خاطر داری کرو گے وہ اتنی ہی تمہاری مخالفت کرے گا۔

علم اور مہارت:

ایک بات اور ہے جس کی طرف توجہ ضروری ہے اور وہ یہ کہ یہ تو صحیح ہے کہ ایمان سب سے بڑی دولت ہے لیکن اس دولت سے فائدہ اُٹھانے کیلئے بھی علم اور ہنرمندی کی ضرورت ہے۔ ورنہ ممکن ہے کہ پورا فائدہ نہ اُٹھایا جا سکے یا ناواقفیت کی بنا پر آدمی کوئی غلطی کر بیٹھے یا کوئی دوسرا اس کے دینی جذبے سے فائدہ اُٹھائے۔ بہرحال یہ بھی ایک لمبی بحث ہے۔

سوالات

سوال: ایمان کے کیا فوائد ہیں؟

سوال: خوبیوں کی بنیاد کس چیز پر ہے؟

سوال: آدمی کے سامنے کونسے دو راستے ہیں؟

سوال: امیر المومنینؑ کے نزدیک کونسی دو باتیں ناقابل برداشت ہیں؟

سوال: روحانی بیماریوں کی دوا اور جسمانی امراض کی شفا کیا چیز ہے؟

سوال: ایمان سے فائدہ اُٹھانے کیلئے کن چیزوں کی ضرورت ہے؟